تعمیر حیات

شعبۂ تعمیر و ترقی
دار العلوم ندوۃ العلماء
لکھنؤ

★

یومِ عاشورہ کا روزہ اور اسکی تاریخی اہمیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشورہ میں روزہ رکھنے کو اپنا اصول و معمول بنا لیا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! اس دن کو تو یہود و نصاریٰ بڑے دن کی حیثیت سے مناتے ہیں (اور یہ گویا ان کا قومی و مذہبی شعار ہے اور خاص اس دن روزہ رکھنے سے ان کے ساتھ اشتراک اور تشابہ ہوتا ہے تو کیا اس میں کوئی ایسی تبدیلی ہو سکتی ہے جس کے بعد یہ اشتراک اور تشابہ والی بات باقی نہ رہے) تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: انشاء اللہ جب اگلا سال آئے گا تو ہم نویں کو روزہ رکھیں گے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: لیکن اگلے سال کا ماہ محرم آنے سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات واقع ہو گئی۔

(صحیح مسلم)

★

٦ محرم الحرام ١٣٩٣ھ
مطابق
١٠ — فروری ١٩٧٣ء

چندہ سالانہ آٹھ روپیہ　　قیمت فی پرچہ ٣٥ پیسے

Regd No. L 1951

FORTNIGHTLY

TAMEER - E - HAYAT

Darululoom Nadwatululama, Lucknow. (India)

مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تازہ پیشکش

صدر یار جنگ

مقدمہ:— حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

تالیف:— مولانا شمس تبریز خاں

صدر الصدور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بیک وقت ایک جید عالم دین، حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مسترشد، سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے صدر الصدور اور خاندانی رئیس تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڈھ کی عظیم تحریکات سے تا حیات وابستہ رہے۔ اس کتاب میں ان اداروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ سوانح ملی تاریخ کی ایک اہم کڑی اور ایک قومی ضرورت کی تکمیل ہے۔ نیز نواب صاحب کے علمی، ادبی کمالات اور ان کے اسلوب تحریر پر سیر حاصل تبصرہ ہے — کتاب نہایت دلچسپ، معلومات افزا اور سبق آموز ہے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ　سائز [illegible]　صفحات ٥٠٠

بہترین ڈسٹ کور ———— قیمت صرف بارہ روپے

مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

★　ملنے کا پتہ　★

مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

Cover Printed at Nadwa Press, Lucknow

تعمیرِ حیات لکھنؤ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد (۱۰) شمارہ (۷)

چندہ — سالانہ ۸ روپے — ششماہی ۴ روپے — قیمت ۲۵ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم نے کیا تیاری کی ہے؟

از: سعید الاعظمی ندوی

ہر دور میں اسلامی نظام پر حملہ کرنے والی جماعتیں اور افراد پائے گئے اور اسلامی اصولوں کے خلاف جنگ کرنے کی تیاریاں بڑے پیمانے پر منظم تحریکوں کے ذریعہ ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس دور میں اسلامی قوانین اور شریعت کے مقرر کردہ اصولوں کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ نہ صرف کسی منظم تحریک کے پس پردہ جاری ہیں بلکہ یہ اس سازش کی ایک بہت بڑی کڑی ہے جو مخالفین اسلام نے خود مسلمانوں کے اندر اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی غرض سے شروع کی تھیں اور جس کے نتیجہ میں تجدد پسند مسلمانوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو اسلام کو چودہ سو سال پہلے کی قدامت سے نکال کر موجودہ زمانہ کی ترقیوں کے مطابق کرنا چاہتا ہے اور جس کا خیال ہے کہ پرانا اسلام نئے زمانے کی زندگی کا ساتھ دینے کی صلاحیت کھو چکا ہے، اس لئے اس میں کانٹ چھانٹ ضروری ہے اور ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔

یہ ایک بہت بڑی سازش کے کامیاب ہونے کی علامت ہے کہ خود مسلمان اس تبدیلی کا مطالبہ کرنے لگیں، اور وہ خدا و انسان کے وضع کردہ قوانین میں کوئی فرق نہ کر سکیں اور وہ اس حقیقت سے بھی منہ موڑ لیں کہ شریعت اسلامی ایک اٹل اور کبھی نہ بدلنے والا وہ قانون الٰہی ہے جو کبھی کسی انسان کے بدلنے سے تبدیل نہیں ہو سکتا اور نہ کسی بشری طاقت کو اس ترمیم و اضافہ کا اختیار دیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ رجحان شدت سے پایا جاتا ہے کہ شریعت کو جامد نہیں ہونا چاہئے۔ اور اصول و قوانین میں لچک اور زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت ضرور ہونی چاہئے یہ دراصل اس تشکیکی ذہن اور اس مرعوبیت کی علامت ہے جو مغربی نظام تعلیم کا خاصہ ہے اور جس نے کسی طرح بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ اسلام ان تمام منصوبوں اور پروگراموں کے لئے زبردست خطرہ ہے جو اہل مغرب نے اپنی بالادستی قائم کرنے اور سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے اقوام مشرق کو بالخصوص اور اقوام عالم کو بالعموم مفلوج کرنے کے لئے بنایا ہے، وہ اس راز سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اسلامی نظام اور اسلامی اصولوں کے غالب آنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہر طرح کی قیادت و سیادت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے چھن جائے اور مسلمان اسلام اس دنیا کے قائدین کر قوموں کے سامنے آ جائیں۔

انھوں نے اندلس پر مسلمانوں کی حکمرانی کی تاریخ کا جائزہ لیا تو انھیں یہ راز اچھی طرح سمجھ میں آ گیا اور اسی وقت کو وہ اسلامی غلبہ و تفوق کے خلاف ہر طرح کی کوششیں کرتے رہے، اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے اسلام کا بغور مطالعہ کیا، اور ان تمام کمزوریوں کا تجزیہ کیا جن کے ذریعہ وہ اسلام کو کمزور بنانے اور اس کے بنیادی عقائد کا احترام ختم کرنے اور مسلمانوں کے دلوں سے اس کی ہیبت اور اس کے وقار کو نکالنے کی تدبیریں سوچ سکیں، اسی سلسلے میں بہت سی ایسی تدبیریں ہو چکی ہیں جن سے اسلام کو براہ راست یا بالواسطہ نقصان پہنچایا گیا، انھیں میں سے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک ایسا گروہ تیار ہو گیا جو اسلام کی طرف سے [illegible] اسلامی نظام کو ایک فرسودہ جمل اور از کار رفتہ نظام تصور کرنے لگا اور [illegible] اسلامی قانون کی ازسرنو ترتیب و تدوین کا نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا۔

مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ صاف [illegible] دی ہوا اور یہ مغرب زدہ ذہن کی ایجاد ہے جو یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ یہی وہ تدبیر ہو جس کے ذریعہ اسلامی [illegible] کی صورت مسخ ہو سکتی ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کا بہانہ ایک ایسا فریب ہے جو [illegible] بدخواہی کا بدترین نمونہ ہے، یہ وہ حربہ ہے جو دشمنان اسلام نے اپنے ناپاک منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے اپنایا ہے اور جس نے سادہ لوح عوام کو دھوکہ دے رکھا ہے، [illegible] دروازہ یقیناً بند نہیں ہوا ہے اور ہر زمانے میں ایسے مسائل پیش آتے رہے ہیں جن میں اجتہاد کی ضرورت پیش آئی ہے۔ لیکن یہ کام تجدد پسند جماعتوں یا افراد کا نہیں ہے۔ [illegible]

(باقی صفحہ ۳ پر)

قرآن کا پیام

(از۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۞ يُوصِيكُمُ اللَّهُ
فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً
فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ
أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ

بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ اللہ تمہیں تمہاری اولاد کی (میراث) کے بارے میں حکم دیتا ہے۔ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے اور اگر دو سے زائد عورتیں (ہی) ہوں تو ان کے لئے دو تہائی حصہ (اس مال) کا ہے جو مورث چھوڑ گیا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لئے نصف حصہ ہے اور مورث کے والدین یعنی ان دونوں میں ہر ایک کے لئے اس (مال) کا چھٹا حصہ ہے جو وہ چھوڑ گیا ہے، بشرطیکہ مورث کے کوئی اولاد ہو اور اگر مورث کے کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے لیکن اگر مورث کے بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے۔ وصیت کے نکالنے کے بعد کہ مورث اس کی وصیت کر جائے۔ یا ادائے قرض کے بعد۔

خیانت غصب، جو یوں تو ہر صورت میں بری ہیں، یتیموں کے مال میں ان کا وقوع شنیع تر ہے۔

یاکلون اموال الیتمیٰ۔ یاکلون سے مراد یتیم کا مال کسی طریقے سے بھی بے جا صرف میں لے آنا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ صرف کھانے ہی کے کام آئے۔

انما ...... نارا۔ یعنی حرام خوری کا انجام یہی ہونا ہے اردو محاورہ میں بھی روپیہ کھا جانا ایسے موقع پر وسیع معنی میں آتا ہے۔

ترکہ کی تقسیم اجتماعی و معاشرتی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کے عادلانہ تقسیم پر معاشرہ کی فلاح و بہبود کا بہت کچھ مدار ہے۔ اور دوسرے تمام مذاہب و ملل کی کتابیں دنیا کی ہدایت اور رہنمائی کی حیثیت سے کامل نہیں ناقص ہیں جو ایسے مسئلہ کی تفصیلات سے خالی ہوں [illegible] اب تفصیلات یاد دلا دیا گیا کہ یہ احکام کسی بندے کی تجویز کئے ہوئے نہیں، حکیم مطلق اور عالم الغیب، حاکم برحق کے ارشاد کئے ہوئے ہیں۔

فی اولادکم۔ اولاد کے معنی بھی سمجھ لینے کے قابل ہیں [illegible]

ہوگی اس لئے کہ نسب لڑکے ہی سے چلتا ہے لڑکی سے نہیں، فقہاء مفسرین نے اسے صاف کر دیا ہے۔

یہ ایک عام اصل بیان کر دی کہ ہر لڑکے کو دوہرا اور ہر لڑکی کو اکہرا حصہ ملے گا خواہ لڑکا اور لڑکی ایک ایک ہوں یا کئی۔

حظ الانثیین۔ دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی قومیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد اور مردوں میں بھی صرف بالغ اور قابل حرب مرد تھے۔ ایسے قانون کا ظالمانہ اور خلاف فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے لیکن اب اس کے رد عمل کے طور پر بعض حلقوں سے جو یہ صدا اٹھی ہے کہ مرد و عورت کا حصہ برابر ہونا چاہئے، یہ دوسری [illegible] افراط کی تفریط ہے۔ عورت کی فطری ساخت اس کی جسمانی ترکیب اور [illegible] [illegible] اور تربیت نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکر معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈالی جائیں [illegible] گھر اور خاندان کا خرچ چلانا [illegible] ظلم نہیں عین عدل ہے [illegible] ترکہ میں حصہ [illegible] سسرال میں شوہر کے ترکہ میں حصہ

اس طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی

(یا صرف دو ہی ہوں)

ان کن نساء۔ یعنی اگر وارث صرف لڑکیاں ہی ہوں۔

فوق اثنتین۔ فوق کے معنی یہاں لازمی طور پر زائد کے نہیں، یہ صلہ بقول بعض مفسرین کے محاورہ عرب میں اکثر زائد بھی آ جاتا ہے اور خود قرآن مجید میں بھی صلہ کے زائد استعمال کے مثال موجود ہے۔ مثلاً فاضربوا فوق الاعناق۔

لیکن مفسر ابن کثیر نے اس معنی ترکیب کے اختیار اور اس خیال زائد پر سخت کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ بلا معنی کوئی زائد کلمہ لے آنا بلاغت قرآنی کے منافی ہے۔ وھذا غیر مسلم لا ھنا ولا ھناک فانہ لیس فی القرآن شیء زائد لا فائدۃ فیہ وھذا ممتنع اور ایسا ہی قول صاحب بحر المحیط نے بھی کیا ہے۔

امام رازیؒ نے یہاں یہ سوال پیدا کیا ہے کہ النساء تو خود ہی صیغہ جمع ہے پھر اس کے ساتھ فوق اثنتین لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور خود ہی جواب دیا کہ یہ تاکید کلام کی غرض سے ہے جیسا کہ قرآن مجید کی بعض دوسری آیتوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً انما یاکلون فی بطونھم نارا، لا تتخذوا الٰھین اثنین

لڑکیاں اگر تعداد میں دو ہوں تو ان کا کل حصہ ثلثین ہونا ظاہر ہے ہر ایک کو ثلث کے حساب سے۔ لیکن یہ شرح نہیں ختم ہو جاتی [illegible] کل جائے گا بلکہ لڑکیاں جتنی بھی

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

مسلمانوں کو امت بننے کی دعوت

از: مولانا محمد یوسف علیہ الرحمۃ

امت کے بگاڑنے اور بنانے میں جوڑنے اور توڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے۔ یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے۔ زبان سے ایک بات نکلی اور دل کٹ جاتے ہیں اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات بڑے بڑے اختلاف مٹا دیتی ہے اور بچھڑے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس لئے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبان پر قابو ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے جب بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے سامنے ہے اور اس کی ہر بات کو سن رہا ہے۔

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ ان میں پشتوں سے عداوت اور لڑائی چلی آ رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے اور انصار کو اسلام کی توفیق ملی تو حضور کی اور اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہو گئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں سے [illegible] ایک مجلس میں جس میں دونوں قبیلوں کے آدمی موجود تھے ایک سازشی آدمی نے [illegible] کچھ شعر پڑھ کر اشتعال پیدا کر دیا تو ایک دوسرے کے خلاف زبانیں چلیں [illegible] ہتھیار نکل آئے۔ حضور کو جب خبر ہوئی آپ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کرو گے۔ آپ نے بہت [illegible] دونوں [illegible] رونے لگے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون الخ

مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنا چاہئے اور [illegible] جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا اس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اس کی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اسے نہ بہکا سکے گا، اور امت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمة اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منہا۔

اور اللہ کی رسی کو یعنی اس کی کتاب پاک اور اس کے دین کو سب کو مضبوطی سے پکڑے رہو یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور امت کی وحدت کے ساتھ سب مل کر دین کی رسی کو تھامے رہو اور اسی پر لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر [illegible] اور جدا جدا نہ ہو اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پشتوں سے چلی آ رہی تھی تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی بنا دیا اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے بس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچا لیا۔

شیطان تمہارے ساتھ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی کی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر فساد سے اور ہر برائی سے روکنا ہو۔

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر واولئک ہم المفلحون۔

امت میں ایک گروہ وہ ہو جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی دعوت اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلائے، ایمان کے لئے اور خیر اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لئے محنت کرتا ہے، نمازوں پر محنت کرے، ذکر پر محنت کرے، برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لئے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے امت ایک امت بنی رہے۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءہم البینت واولئک لہم عذاب عظیم۔

جو لوگ ان ہدایتوں کے بعد بھی شیطان کی پیروی کر کے اور الگ الگ راہیں چل کے اختلاف پیدا کریں گے اور امت کے امت پنے کو توڑ دیں گے تو ان پر خدا کی سخت مار پڑے گی۔ واولئک لہم عذاب عظیم۔

دین کی ساری تعلیم اور ساری چیزیں جوڑنے والی اور جوڑنے کے لئے ہیں۔ نماز میں جوڑ ہے، روزہ میں جوڑ ہے، حج میں قوموں اور ملکوں اور مختلف زبان والوں میں جوڑ ہے۔ تعلیم کے حلقے جوڑنے والے ہیں۔ مسلمانوں کا اکرام اور باہم محبت اور تحفہ کی لین دین یہ سب جوڑنے والی اور جنت میں لے جانے والی چیزیں ہیں اور قیامت میں ان اعمال کے لئے محنت کرنے والوں کے چہرے نورانی ہوں گے اور ان کے برخلاف باہم بغض و حسد، غیبت، چغلخوری، توہین و تحقیر اور دل آزاری یہ سب پھوٹ ڈالنے والے اور توڑنے والے اور دوزخ میں لے جانے والے اعمال ہیں اور ان اعمال والے آخرت میں روسیاہ ہوں گے۔

یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ فاما الذین اسودت وجوہہم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون۔ واما الذین ابیضت وجوہہم ففی رحمة اللہ ہم فیہا خلدون۔

جنہوں نے پھوٹ ڈالی ہے اور پھوٹ والے اعمال کر کے امت کو توڑا ہو گا وہ قیامت کے دن قبروں سے کالے منہ اٹھیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان و اسلام کے بعد کفر والوں کا راستہ اختیار کیا۔ اب تم یہاں دوزخ کا عذاب چکھو اور جو ٹھیک راستے پر چلتے رہے ہوں گے ان کے چہرے نورانی اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں اور جنت میں رہیں گے۔

میرے بھائیو دوستو! یہ سب آیتیں اس وقت اتری ہیں جب یہود نے انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور ان کے دو قبیلوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ ان آیتوں میں مسلمانوں کے باہمی پھوٹ اور لڑائی کو کفر کی بات کہا گیا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ آج ساری دنیا میں امت پنا توڑنے کی محنت چل رہی ہے۔ اس کا علاج اور توڑ یہی ہے کہ تم اپنے حضور والی محنت لگاؤ، مسلمانوں کو مسجدوں میں لاؤ، وہاں ایمان کی باتیں ہوں، تعلیم اور ذکر کے حلقے ہوں، دین کی محنت کے مشورے ہوں، مختلف طبقوں کے اور مختلف برادریوں اور مختلف زبانوں والے مسجد نبوی کے طریقہ پر ان کاموں میں جڑیں۔ جب امت پنا آنے لگا، ان باتوں سے بچیں جن سے شیطان کو پھوٹ ڈالنے کا موقع ملے۔ جب تین بیٹھیں تو اس کا خیال رکھیں کہ چوتھا ہمارے ساتھ اللہ ہے۔ چار بیٹھیں تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ پانچواں یا چھٹا ہمارے ساتھ اللہ بھی موجود ہے اور وہ ہماری ہر بات سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ ہم امت بنانے کی بات کر رہے ہیں یا امت توڑنے کی۔ ہم کسی کی غیبت اور چغلخوری تو نہیں کر رہے ہیں، کسی کے خلاف سازش تو نہیں کر رہے۔ یہ امت حضور کے خون اور فاقوں سے بنی ہے۔ اب ہم اپنی معمولی معمولی

(باقی صفحہ پر)

مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج

از: مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہٗ

جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت حق لے کر کھڑے ہوئے آپ تنہا تھے کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا۔ دنیوی کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی، آپ کی قوم میں خودسری اور خودرائی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی حق بات سننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ بالخصوص جس کلمۂ حق کی آپ تبلیغ کرنے کھڑے ہوئے تھے اس سے تمام قوم کے قلوب متنفر اور بیزار تھے۔ ان حالات میں کونسی طاقت تھی جس نے ایک مفلس و نادار بے یار و مددگار انسان نے تمام قوم کو اپنی طرف کھینچا۔ اب غور کیجئے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس کی طرف آپ نے مخلوق کو بلایا اور جس نے اس چیز کو پالیا وہ پھر ہمیشہ کے لئے آپ کا ہو رہا۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک سبق تھا جو آپ کا مطمح نظر اور مقصود اصلی تھا جس کو آپ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ (آل عمران ع ۷)

بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی دوسرے کو رب قرار دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

اللہ وحدہ لاشریک لہ کے سوا ہر شے کی عبادت و اطاعت اور فرمانبرداری کی ممانعت کی اور اغیار کے تمام بندھنوں اور طوقوں کو توڑ کر ایک نظام عمل مقرر کر دیا اور بتلا دیا کہ اس سے ہٹ کر کسی دوسری طرف رخ نہ کرنا۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (اعراف ع ۱)

تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے اور خدائے تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کا اتباع مت کرو۔

یہی وہ اصل تعلیم تھی جس کی طرف دعوت کا آپ کو حکم ملا:

ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلہم بالتی ہی احسن ان ربک ہو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وہو اعلم بالمہتدین (نحل ع ۱۶)

اے محمد بلاؤ لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور نیک نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کرو جس طرح بہتر ہو بیشک تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے اس شخص کو جو گمراہ ہوا اس کی راہ سے، وہی خوب جانتا ہے راہ چلنے والوں کو۔

اور یہی شاہراہ تھی جو آپ کے لئے اور آپ کے ہر پیرو کے لئے مقرر کی گئی۔

قل ہذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرة انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین (یوسف ع ۱۲)

کہہ دو یہ ہے میرا راستہ بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے تابع ہیں وہ بھی اور اللہ پاک ہے اور میں شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین (حم سجدہ ع ۴)

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مخلوق کو بلانا، بھٹکے ہوؤں کو راہ حق دکھلانا، گمراہوں کو ہدایت کا راستہ دکھلانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وظیفۂ حیات اور آپ کا مقصد اصلی تھا اور اسی مقصد کی نشو و نما اور آبیاری کے لئے ہزاروں نبی اور رسول بھیجے گئے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون (الانبیاء ع ۲)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی رسول مگر اس کی جانب یہی وحی بھیجتے تھے کہ کوئی معبود نہیں بجز میرے پس میری بندگی کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور دیگر انبیاء کرام کے مقدس لمحات زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کا مقصد اور نصب العین صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ جل شانہ وحدہ لاشریک لہ کی ذات و صفات کا یقین کرنا، یہی ایمان اور اسلام کا مفہوم ہے اور اسی لئے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ جن اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ بندہ بن کر زندگی بسر کریں۔

اب جب کہ مقصد زندگی واضح ہو گیا اور اصل مرض اور اس کے صحیح نتیجہ کی توجیہ معلوم ہو گئی تو اس کے علاج کی تجویز بہت زیادہ دشوار نہیں رہ جائے گی اور اس نظریے کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا انشاء اللہ نافع اور سود مند ہوگا۔

ہم نے اپنی ناقص سمجھ کے مطابق مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک نظام عمل تجویز کیا ہے جس کو فی الحقیقت اسلامی زندگی یا اسلاف کی زندگی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے جس کا اجمالی نقشہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

سب سے اہم اور مقدم چیز یہ ہے کہ ہر مسلمان تمام ذاتی مقاصد دنیوی سے قطع نظر کر کے اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعت اسلام اور احکام خداوندی کے رواج اور سرسبزی کو اپنا نصب العین بنا دے اور اس بات کا پختہ عہد کرے کہ حق تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا اور کبھی خداوند کریم کی نافرمانی نہ کروں گا اور اس نصب العین کی تکمیل کے لئے اس دستور العمل پر کاربند ہو۔

(۱) کلمۂ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا صحت الفاظ کے ساتھ یاد کرنا اور اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھنا اور اس کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرنا اور اپنی پوری زندگی کو اس کے موافق بنانے کی فکر کرنا۔

(۲) نماز کا پابند ہونا، اس کے آداب و شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا اور ہر رکن میں خداوند کریم کی عظمت و بزرگی اور اپنی بندگی اور بیچارگی کا دھیان کرنا، غرض اس کوشش میں لگے رہنا کہ نماز اس طرح ادا ہو جو اس رب العزت کی بارگاہ کی حاضری کے شایان شان ہو۔ ایسی نماز کی کوشش کرتا رہے اور حق تعالیٰ سے اس کی توفیق طلب کرے۔ اگر نماز کا طریقہ معلوم نہ ہو تو اسے سیکھے اور نماز میں پڑھنے کی تمام چیزوں کو یاد کرے۔

(۳) قرآن کریم کے ساتھ وابستگی اور دلبستگی پیدا کرنا جس کے دو طریقے ہیں۔

(الف) کچھ وقت روزانہ ادب و احترام کے ساتھ معنی و مفہوم کا دھیان کرتے ہوئے تلاوت کرنا۔ اگر عالم نہ ہو اور معنی و مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہو تب بھی بغیر معنی سمجھے کلام ربانی تلاوت کرے اور سمجھے کہ میری فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے۔ محض الفاظ کا پڑھنا بھی سعادت عظمیٰ ہے اور موجب

(باقی صفحہ [illegible] پر)

یومِ عاشورہ ایک تاریخی دن

جو یومِ نجات بھی ہے اور یومِ عبرت بھی

سید ابو الحسن علی ندوی

محرم کے مہینے کا دسواں دن جس کو عام طور پر عاشورہ کہتے ہیں کچھ ایسی تاریخی خصوصیت رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک یادگار دن بن گیا ہے۔

آج سے کئی ہزار برس پہلے تاریخ عالم میں اسی روز حق و باطل کی کشمکش کا ــــ فیصلہ ہوا تھا۔ مصر کی متمدن سرزمین میں شاہ وقت فرعون نے پیغمبروں کی اولاد بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا اور ان سے سخت بیگار لیتا تھا، ان کے ساتھ جانوروں کا سلوک کرتا تھا، ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی اور مساویانہ شہری حقوق سے محروم کر رکھا تھا، محض یہ کہ آنے والے زمانے کے ایک خطرے کی بنا پر ان کے بچوں کو ذبح کر ڈالنے کا حکم دے رکھا تھا، وہ خود خدائی کا دعویدار تھا اور اس کی سرزمین پر خدا پرستی کی زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا، پوری کی پوری قوم اس کے پنجۂ غضب میں گرفتار تھی۔ قرآن مجید نے اس صورت حال کی تصویر کھینچ دی ہے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝

بے شک فرعون سرزمین (مصر) میں سرکش ہو گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف جتھے کر رکھا تھا، ان میں سے ایک جماعت (بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا، ان کے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، واقعی وہ بڑا مفسد تھا۔

اس صورت حال میں ہر طرف سے مایوسی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، بنی اسرائیل کا مستقبل بظاہر تاریک معلوم ہوتا تھا، ان کی آزادی اور نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، ان کے بیان سے جو کچھ پیدا ہوتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ فرعون اور اس کی قوم کی غلامی اور اس ملک میں ذلیل و محکوم رہنے کے لئے پیدا ہوا ہے، آس پاس بھی کوئی ایسی سلطنت نہ تھی جو اس بدقسمت اور مظلوم قوم کی حمایت کرتی، مایوسی کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ایک پرجلال آواز اعلان کرتی ہے۔

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝

اور ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جن کو کمزور کیا گیا زمین میں اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو ملک کا مالک بنائیں۔

پھر کیا ہوا؟ ہر طرح کے اندازے اور قیاس کے خلاف حالات اور واقعات کے بالکل برعکس پیغمبر وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اشارۂ غیبی ہوتا ہے کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے نکال کر لے جائیں اور نجات کی سرزمین فلسطین میں سکونت اختیار کریں۔ مصر سے فلسطین جانے کے لئے خشکی کی ایک تنگ سی پٹی تھی جو افریقہ اور ایشیا کو ملاتی ہے، عام طور پر فلسطین جانے کا یہی راستہ تھا، لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا، موسیٰ علیہ السلام نے بجائے شمال کی طرف جانے کے مشرق کا راستہ اختیار کیا۔ جب صبح کا تڑکا ہوا تو انھوں نے اچانک دیکھا کہ وہ بحر قلزم (بحر احمر) کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں، ادھر کسی کی نظر پیچھے کی طرف اٹھی تو دیکھا کہ فرعون مع لشکر کے ساتھ سر پر پہنچ گیا ہے۔ بنی اسرائیل اس منظر کو دیکھ کر کہ سامنے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا غضب ناک لشکر، چیخ اٹھے "إِنَّا لَمُدْرَكُونَ" (ہم تو پکڑے گئے) ــــ لیکن موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے وعدہ پر بھروسہ اور اپنی قوم کی نجات کا یقین تھا۔ انھوں نے پیغمبرانہ اطمینان اور یقین سے کہا۔

كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝

ایسا کبھی ہو سکتا ہے، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے ضرور راستہ بتائے گا۔

چنانچہ انھوں نے سمندر میں قدم رکھا اور قدرت خداوندی سے ایک خشک راستہ بن گیا جس پر وہ آرام و اطمینان سے چل کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے جو فرعون کی سلطنت سے باہر تھا۔ فرعون نے یہ دیکھ کر کہ ایک ہموار راستہ ہے اور بنی اسرائیل اس پر سے گزر رہے ہیں، اپنے لشکر کے گھوڑے ڈال دیئے۔ غضب ناک سمندر نے جس کو صرف بنی اسرائیل کو راستہ دینے کا حکم تھا، فرعون اور اس کے پورے لشکر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور اپنے وقت کا عظیم ترین فرمانروا جس کو خدائی کا دعویٰ تھا، اس کی بے پناہ موج سمندر کا لقمہ بن گیا۔ بنی اسرائیل فرعون کی اس عظیم الشان سلطنت کے وارث بنے جس میں انھوں نے سیکڑوں برس کی غلامی کی تھی اور جس میں آزادی اور بادشاہی کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ

(اعراف)

اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس سرزمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون کے اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا۔

یہ اسی مبارک دن میں پیش آیا۔ بنی اسرائیل نے قدرتی طور پر اس دن کو ایک قومی جشن کا دن بنا لیا۔ وہ اس دن شکرانے کا روزہ رکھتے اور اپنی مسرت و شکر کا اظہار کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جب مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت فرمایا یہ کیسا روزہ ہے؟ عرض کیا گیا کہ آج ہی کے روز اللہ نے موسیٰ اور بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دی، اس کے شکرانے میں روزہ رکھا جاتا ہے۔ فرمایا، موسیٰ علیہ السلام یہودیوں سے زیادہ ہمارے ہیں، ہم کو شکرانے کا زیادہ حق ہے۔ چنانچہ آپ نے بھی اس دن کا روزہ رکھا لیکن چونکہ اسی دن کا روزہ رکھنے میں یہودیوں سے مشابہت تھی، اس لئے آپ نے فرمایا، اگر زندگی رہی تو اگلے سال میں نویں تاریخ

کا روزہ بھی ملا لوں گا، لیکن اس کی نوبت نہ آئی اور آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یوم عاشورہ کی یہی اہمیت اور حیثیت ہے کہ وہ ایک پیغمبر اولو العزم کی کامیابی اور نجات کا دن ہے اور اس میں اظہار شکر کے لئے روزہ مستحب اور مسنون ہے۔

لیکن اسی دن دسویں تاریخ کو تاریخ اسلام میں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا جس نے اس دن کو عبرت و موعظت کا دن بنا دیا۔ ۶۱ھ میں نواسۂ رسولؐ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حکومت بنی امیہ اور اس کے سربراہ یزید بن معاویہ کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی اس حکومت نے خلافت راشدہ کے بجائے عجمی ملوکیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا، اس کے اندر سے زہد و تقشف اور خدمت و ایثار کی وہ روح نکل گئی تھی جو اسلامی حکومت کا طغرائے امتیاز اور خلافت نبوت کا شعار ہے، اس کی جگہ عیش و عشرت، نفس پروری، اسراف و فضول خرچی نے لے لی، مسلمانوں کا بیت المال، خزانۂ شاہی اور صرف خاص کا محکمہ بن گیا تھا۔ یزید کے عادات و اخلاق خلفائے راشدین کی سیرت و زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے تھے، ایک خوش باش اور عیش پسند نوجوان بادشاہ تھا۔ خلافت کا نہایت بیش قیمت اور مقدس ادارہ نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ کر ضائع اور ذلیل ہو رہا تھا اور اسلام میں آمرانہ شاہی کی ایک بری نظیر قائم ہو رہی تھی۔ سیدنا حسینؓ نے اس صورت حال کے خلاف علم جہاد بلند کیا، انھوں نے یزید کی خلافت کا انکار کر کے ظاہر کیا کہ وہ اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہر قوت قابل تعظیم و تقدیس ہے اور ہر غلط و صحیح نظام کو تسلیم کرنا ضروری ہے، انھوں نے اپنے طرز عمل سے اپنے جد امجد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کی توثیق کی۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

حکومت وقت نے خطرہ کا پورا احساس کیا، حضرت حسینؓ جیسے سردار کی مخالفت اور اعلان جنگ معمولی بات نہ تھی، چنانچہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بڑی فوجی طاقت روانہ کی گئی۔ کربلا کے میدان میں دونوں جماعتوں کا مقابلہ ہوا، ایک طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے گنتی کے ساتھیوں اور اہل خاندان کے ساتھ تھے، ان کو جن لوگوں نے بلایا تھا اور ان کی وفاداری اور رفاقت کا وعدہ کیا تھا وہ ساتھ چھوڑ چکے تھے، دوسری طرف ایک تازہ دم کثیر التعداد مسلح افواج تھی۔ اس موقع پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جس استقامت و شجاعت اور جس خوش دلی و عالی ہمتی کا ثبوت دیا وہ ہر طرح سے اہل بیت کے شایان شان تھی اور اس نے ان کو دنیا کے ان ممتاز شہسواروں میں شامل کر دیا ہے جو اپنے عقیدے اور مقصد کی خاطر نتائج سے بے پروا ہو کر جان دے دیتے ہیں۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ

ان ایمان والوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہادت سے سرخرو کیا۔ قوت لشکر، وری برادر کثرت نے قلت پر عارضی فتح حاصل کر لی، لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ایمانی جرأت، اخلاقی عظمت اور مردانہ عزم و ہمت کا نقش تاریخ کی پیشانی پر کندہ ہو گیا۔ انھوں نے غلط حکمران کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور مخالف حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر کے اسلام میں ایک نہایت صحیح اور ضروری نظیر قائم کر دی جو صدیوں تک قلوب میں ہمت و عزیمت اور تاریکیوں میں روشنی و رہنمائی پیدا کرتی رہے گی۔ اگر یہ نظیر نہ ہوتی تو تاریخ اسلام میں ایک خلا اور داغ رہ جاتا جس کا مٹانا آسان نہ تھا۔

تاریخ کے یہ دونوں واقعات ایمان و یقین، ہمت و جرأت کا سبق دیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خدا کے مقبول اور صاحب یقین بندے کس طرح خدا کے وعدوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور کس طرح اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو بھی اطاعت اور خدائی احکام پر قربان کرتے ہیں اور کس طرح نتائج سے آنکھیں بند کر کے سمندر کی موجوں اور جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

بقیہ مسلمانوں کو امت بننے کی دعوت

باتوں پر امت کو توڑتے ہیں یاد رکھو نماز جمعہ چھوڑنے پر بھی اتنی پکڑ نہیں ہوگی جتنی امت کے توڑنے پر ہوگی، اگر مسلمانوں میں امت پنا آ جائے تو دنیا میں ہرگز ذلیل نہ ہوں گے روس اور امریکا کی طاقتیں بھی ان کے سامنے جھکیں گی اور امت پنا جب آئے گا جب "أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ" پر مسلمانوں کا عمل ہو یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں چھوٹا بننے اور ذلت و تواضع اختیار کرنے کو اپنائے، تبلیغ میں اسی کی مشق کرائی ہے۔ جب مسلمانوں میں "أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ" والی صفات آ جائے گی تو وہ دنیا میں "أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ" یعنی کافروں کے مقابلے میں زبردست اور غالب ضرور ہوں گے چاہے وہ کافر یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔

میرے بھائیو دوستو! اللہ و رسولؐ نے ان باتوں سے نفرت اور سختی سے منع فرمایا ہے جن سے دلوں میں فرق پڑے اور پھوٹ کا خطرہ بھی ہو۔ دو دو چار چار الگ الگ کانا پھوسی کریں اس سے شیطان دلوں میں بدگمانی پیدا کر سکتا ہے اس سے منع فرمایا گیا ہے اور اس کو شیطانی کام بتایا گیا۔ "إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ" اسی طرح تحقیر اور استہزا اور تمسخر کو منع فرمایا گیا۔ "لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ" اس سے بھی منع فرمایا گیا کہ دوسرے کی برائی جو معلوم نہ ہو اس کو تجسس کر کے معلوم کیا جائے اور جو برائی کسی کی معلوم ہو گئی اس کو دوسروں کے سامنے ذکر کرنے سے منع فرمایا گیا اور غیبت کو حرام کیا گیا۔ غیبت اس کا نام ہے جو کچھ برائی کسی کی معلوم ہو اس کا ذکر کسی سے کیا جائے۔ "وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا" یہ تحقیر اور تمسخر اور تجسس اور غیبت سب وہ چیزیں ہیں جو آپس میں تفرقہ پیدا کر کے امت پنے کو توڑتی ہیں، ان سب کو حرام قرار دیا گیا۔ اور ایک دوسرے کا اکرام و احترام کرنا جس سے امت پنا جڑتا اور بنتی ہے اسی کی تاکید فرمائی گئی اور دوسروں سے اپنا اکرام چاہنے سے منع کیا گیا کیوں کہ اس سے امت پنا نہیں جڑتی ہے۔ امت جب بنے گی جب ہر آدمی یہ طے کرے کہ میں عزت کے قابل نہیں ہوں، اس لئے مجھے عزت لینی نہیں بلکہ دوسروں کی عزت کرنی ہے اور دوسرے سب لوگ اس قابل ہیں کہ میں ان کی عزت کروں، ان کا اکرام کروں۔

اپنے نفسوں اور اپنی ذاتوں کو قربان کیا جائے گا تو امت بنے گی اور امت بنے گی تو عزت ملے گی اور عزت اور ذلت روس اور امریکا کے قبضوں میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ہاں اصول اور ضابطہ ہے۔ جو شخص یا قوم، خاندان طبقہ جھکانے والے اصول اور اعمال لا دے گا اسی کو جھکا دیں گے، جو مٹنے والے کام کرے گا اس کو مٹا دیں گے۔ یہود نبیوں کی اولاد میں اصول توڑے تو اللہ نے ٹھوکر مار کے ان کو توڑ دیا، صحابہ کرام بت پرستوں کی اولاد تھے انھوں نے جھکنے والے اصول اختیار کئے تو اللہ نے ان کو جھکا دیا۔ اللہ کی کسی سے رشتہ داری نہیں، اس کے ہاں اصول اور ضابطہ ہے۔

دوستو! اپنے کو اس محنت میں جھونک دو کہ حضورؐ کی امت میں امت پنا آ جائے، اصل ایمان و یقین آ جائے، یہ ذکر و تسبیح اور تعلیم والی، خدا کے سامنے جھکنے والی محنت کریں اور دوسروں کا اعزاز و اکرام کرنے والی امت بنائے، محض ذکر کرنے والی اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کی تحقیر و تمسخر اور غیبت کرنے والی امت نہ بنائے۔ اگر کسی ایک علاقہ میں بھی یہ محنت اس طرح ہونے لگے جس طرح ہونی چاہیے تو ساری دنیا میں بات چل پڑے۔ اب اسی کا اہتمام کرو کہ مختلف قوموں، علاقوں اور طبقوں، زبان والوں کو جوڑ جوڑ کر جماعتوں میں بھیجو اور اصول کی پابندی کراؤ،

پھر انشاء اللہ امت بننے والا کام ہوگا۔ اور شیطان اور نفس، خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

دین کی تعریف اور ضرورت

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ
بے شبہ اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔

اب سب سے پہلے معلوم یہ ہونا چاہیے کہ دین کسے کہتے ہیں، اس کی تعریف کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟

دین کی تعریف:

دین عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی معاملہ کرنے کے ہیں۔ عربی میں ایک محاورہ ہے [illegible] ہم نے ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جیسا کہ انھوں نے کیا تھا۔

اصطلاح شریعت میں [illegible] نظام زندگی کو کہتے ہیں [illegible] ایک انسان اس دنیا میں جو کچھ کرے خواہ وہ اپنے ساتھ کرے یا کسی اپنے پرائے کے ساتھ وہ سب خدا کے حکم کے ماتحت ہو۔

دین کی ضرورت:

دین کی ضرورت کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے سے پہلے امور ذیل [illegible]

(۱) انسان چونکہ مدنی الطبع ہے یعنی جانوروں اور چوپایوں کی طرح الگ تھلگ زندگی بسر نہیں کرتا اور کر سکتا ہے بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے پر فطرتاً مجبور ہے [illegible] ہر قسم کے معاملات میں ہوتے ہیں جو اسے پیش آتے ہیں اور وہ ان کے متعلق کسی ایک حکم [illegible] انسانی معاشرے کو [illegible] اس لئے یہ ضروری ہے کہ [illegible] معاملات میں ایک [illegible] یا ایک جماعت اور [illegible] کے لئے کوئی حکم ایسا ہونا چاہیے جس سے ایک انسان [illegible] اور جس میں اس کے حق کا کسی دوسرے [illegible] نہ ہو۔

(۲) [illegible] کر رہا ہو اس کو کم سے کم قیمت پر مل جائے۔ اس وقت اس کے دماغ میں یہ خیال بالکل نہیں ہوتا کہ بائع کو اس صورت میں نفع ہوگا یا نقصان۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان فطرتاً مفاد پرست ہوتا ہے، اسے اپنی منفعت کے پیچھے دوسرے کے نقصان کا مطلق خیال نہیں اور اپنی لذت کوشی کی خاطر دوسرے کی اذیت کا ذرا بھی دھیان نہیں رہتا۔ وہ اپنے اندرونی جذبۂ طلب و جستجو کو تسکین دینے کے لئے بسا اوقات ایسی مذموم حرکات کر بیٹھتا ہے جو اسے مرتبۂ انسانیت سے گرا دیتی ہیں۔

(۳) ہر فعل و عمل، ہر معاملہ اور ہر برتاؤ میں اچھے برے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ کے پاس ایک سائل آیا ہے اور وہ آپ سے امداد کا خواہاں ہے۔ آپ اس وقت اچانک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ سائل کے سوال کو پورا کر دینا چاہیے یا نہیں، بلکہ تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگتے ہیں کہ اگر اس سائل کا سوال پورا کر دیا گیا تو آپ کے پاس اس قدر روپیہ کم ہو جائے گا۔ پھر اس سائل کو دیکھ کر دوسرا سائل آئے گا اور پھر سلسلہ اسی طرح دراز رہا تو اپنی ساری دولت دے چکنے پر بھی ارباب احتیاج کی حاجت و ضرورت رفع نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی خیال آتا ہے کہ سائل ایک ضرورت مند اور غریب آدمی ہے اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔

(۴) یہ دنیا تنازع للبقا کی جگہ ہے۔ ایک شخص اپنے کو طاقتور اس وقت سمجھتا ہے جب کہ دوسرے کمزور ہوں۔ ایک دولتمند اپنی دولتمندی کا راز اسی میں مضمر جانتا ہے کہ اس کے ہم قبیلہ و ہم جماعت غریب ہوں۔ ایک حکومت اپنے استحکام کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ دوسری حکومتوں کو اپنا باج گذار بنا لے۔ یہ جذبہ چونکہ کسی ایک شخص میں نہیں بلکہ کسی میں کم کسی میں زیادہ سب میں ہوتا ہے اور جس کو جتنا اس جذبے کی تسکین کا موقع ملتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہیں کرتا۔ اس بنا پر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصادم و تزاحم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انسان کی فطرت میں خیر و شر دونوں کا مادہ ہے۔ اس لئے اس طرح کے تصادم میں بسا اوقات اس کے شر کی قوت خیر کی طاقت پر غالب آجاتی ہے اور اب وہ قتل و قتال اور نہب و سلب جملہ جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کسی میں اسے کوئی باک نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر انسانی معاشرے میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور ایک انسان کو دوسرے انسان پر ظلم و زیادتی سے یا خود اپنے اوپر ظلم کرنے سے باز رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسانی معاشرہ کسی ایک قانون یا دستور کا پابند ہو۔ پہلے زمانہ میں شخصی حکومتیں ہوتی تھیں اور پوری مملکت میں امن و امان کے قیام کا دار و مدار ایک شخص کے اشارۂ چشم و ابرو پر ہوتا تھا۔ آج کل دستوری اور آئینی حکومت کا زمانہ ہے۔ عوام کے نمائندے خود ایک آئین و دستور بناتے ہیں اور پھر خود ہی ایک نمائندہ حکومت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسانی معاشرے میں امن و امان اور سکون و اطمینان کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس معاشرے کے تمام افراد کا ایک مرکز اطاعت ہو۔ یہ مرکز کوئی ایک شخص ہو جیسا کہ شخصی حکومتوں کے زمانہ میں ہوتا تھا، یا کوئی قانون، آئین اور دستور ہو جیسا کہ دستوری اور جمہوری حکومتوں میں ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر ملک کا قانون، ہر مملکت کا مرکز اطاعت دوسرے ملک سے مختلف ہوتا ہے اور اگر قانون مختلف نہ ہو تب بھی مرکز اطاعت یعنی جس کے ہاتھ میں قانون کو نافذ کرنے کی طاقت ہے اور جس کو حکومت کہتے ہیں وہ لازمی طور پر ایک ملک کی دوسرے ملک سے مختلف ہوتی ہے۔ اس اختلاف کے باعث دونوں ملکوں یا حکومتوں میں تصادم اور تزاحم کا جو امکان ہوتا ہے اس سے تحفظ کی صورت یہ کی جاتی ہے کہ بین الملکی معاہدے ہوتے ہیں اور معاہدوں کے دونوں فریق اس عہد نامہ کے ذریعہ پر امن و بے خوف و خطر زندگی بسر کر سکنے کی توقع کرتے ہیں۔ بہرحال ایک ہی ملک کے لوگوں کا معاملہ ہو یا ایک ملک کا دوسرے ملک کے لوگوں کے ساتھ بین الملکی معاملہ ہو، انسانی معاشرہ کے اطمینان و سکون اور اس کی عافیت و خوشحالی کا انحصار اس ایک قانون و دستور یا اس معاہدہ پر ہے جو سب نے مان لیا ہو اور جس کی پابندی کا سب نے عہد کیا ہو۔

انسانی دستور:

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ایک دستور، آئین یا قانون و

معاہدہ کی محض پابندی کا اعلان انسانی معاشرے کو امن و عافیت کی وہ نعمت و راحت بخش دیتا ہے جس کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا؟ غالباً اس سوال کا جواب آج جتنا آسان ہے کبھی نہ ہوا ہوگا۔

آج مجلس اقوام متحدہ کے ماتحت پوری دنیا ایک مشترکہ دستور کے رشتہ سے بندھی ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود پوری انسانی آبادی معلوم ہوتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب یہ پہاڑ پھٹ جائے اور آدم و حوا کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ہلاکت و بربادی کے کس قعر عظیم میں گرا دے گا۔ ارباب جاہ و ثروت، عشرت و راحت کی خود فراموشیوں میں اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کرۂ ارض کے اوپر بسنے والے ایک ایک انسان کا دل چیر کر دیکھو اس کی تہ میں غم و اضطراب اور تشویش و فکر مندی کی دبی ہوئی لہریں ملیں گی۔ آج کا دن اگر خیریت سے گزر گیا تو نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا! اس نے اپنی عقل و فراست کے ناخن سے نوامیس فطرت کی قبا کا ایک ایک بند اور عالم الطبیعات کے سربستہ اسرار کی ایک ایک گرہ کھول کر رکھ دی ہے، لیکن اب وہ اپنی فتوحات پر نازاں نہیں بلکہ خود پشیمان ہے کیونکہ جن چیزوں کو اس کی عظمت و رفعت کا سب سے بڑا نشان ہونا چاہیے تھا وہی اب اس کی زندگی، اس کی حیات قومی، اس کی تہذیب و تمدن اور اس کے ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئی ہیں اور ان چیزوں کی ایجاد و اختراع میں اب اس کا قدم ایک ایسی منزل میں پہنچ گیا ہے کہ وہ پیچھے بھی نہیں لوٹ سکتا۔ گویا عہد حاضر کے انسان نے اپنی غیر معمولی اور حد درجہ حیرت انگیز عقلی ترقیات کے ہاتھوں اپنے لئے حفاظت و امن کے جو قلعے تعمیر کئے تھے اسے اب جا کر پتہ چلا کہ درحقیقت وہ قلعے نہیں تھے بلکہ ہلاکت و بربادی کی بارود کی ایسی سرنگیں تھیں جو اس نے اپنے چاروں طرف بچھا لی ہیں اور اب اپنے عمل میں صرف ایک دیاسلائی کے تنکے کی محتاج ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ ان سب قوموں نے جس معاہدے پر دستخط کئے ہیں اور انسانی حقوق کے جس چارٹر کی متفقہ طور پر حمایت کی ہے اس کی دفعات کیا ہیں؟ یہی کہ سب انسان برابر ہیں، کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کسی ایک انسانی گروہ کو اس کی آزادی نہیں ہوگی کہ وہ اپنی طاقت و قوت کا ناجائز استعمال کر کے کسی دوسرے گروہ کے کلچر، تہذیب و تمدن اور اس کی قومی روایات کو استعمال کرے۔ جو قومیں اقتصادی اور معاشی اعتبار سے پست و زبوں حال ہیں ان کی مدد کی جائے گی اور جو جہالت کا شکار ہیں ان کو زیور علم سے آراستہ کیا جائے گا، جن کا معیار زندگی پست ہے انھیں اوپر اٹھایا جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس معاہدہ اور حلف نامہ کی ان دفعات پر واقعی عمل ہو تو یہ دنیا کم از کم چند روزہ زندگی کے لئے تو جنت آباد ضرور بن جائے گی، لیکن نتیجہ برعکس نظر آتا ہے اور دنیا روز بروز جہنم زار بنتی جا رہی ہے۔

آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کے اسباب و وجوہ گو ان گنت اور چند در چند ہو سکتے ہیں، لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس ناکامی و نامرادی کا ایک ہی خاص سبب ہے اور وہ یہ کہ ان تمام معاہدہ کرنے والوں نے کسی اپنے سے بالاتر ہستی کے سامنے اپنے عہد و پیمان پر قائم رہنے اور اپنے قول میں صادق اور ثابت قدم رہنے کا عہد نہیں کیا ہے۔ یہ سب معاہدے ایک دوسری قوم کے ساتھ یا دنیا کی سب قوموں کے آپس میں متفقہ معاہدے ہیں جو کسی خوف یا کسی منفعت اور فائدے کی بنا پر کئے گئے ہیں۔ اس لئے جب یہ خوف یا ڈر یا منفعت و مفاد جو اس معاہدہ کے لئے اصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا کسی ایک خاص قوم کے حق میں منتفی ہو جاتا ہے تو اس معاہدہ کی شرائط و دفعات کی پابندی میں بھی خود بخود اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ زبان سے جمہوریت اور مساوات کا نعرہ لگا رہے ہیں ان کے ہاتھوں کو دیکھو خون سے رنگین نظر آئیں گے۔ جو امن و امان اور صلح و آشتی کے لئے آج سب سے زیادہ بے قرار اور اس کے سب سے بڑے علمبردار ہیں ان کے اعمال کا جائزہ لو تو معلوم ہوگا کہ جنگ کی آگ بھڑکا دینا ان کے دل کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ جنھیں دنیا کی پسماندہ اقوام کی مرفہ الحالی کا دعویٰ ہے انھوں نے اقتصادی غلامی کا ہر رنگ زمین دام بچھا رکھا ہے۔ قول اور عمل میں یہ عدم مطابقت، ظاہر و باطن کی یہ مخالفت صرف اس لئے ہے کہ ان قوموں کا مرکز اطاعت قومیت و وطنیت یا جماعتی مفاد و عصبیت ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نوع انسانی کی وحدت میں رخنہ پیدا کرتی ہے اور جو ایک ہی نوع کے افراد کو مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ پھر جن کو ان قوموں نے اپنا مرکز اطاعت قرار دیا ہے خود انھیں کے ہاتھوں کے تراشیدہ اور انھیں کے ذہن و فکر کے آفریدہ ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کو اپنے کسی عمل پر نہ احتساب کا اندیشہ ہے اور نہ کسی فعل پر باز پرس کا خوف۔ مفاد پرستی ان کے عمل کا سب سے بڑا محرک، سب سے بڑا اصل جذبہ زندگی اور سب سے زیادہ موثر آئین حیات ہے۔ اس لئے وہ اعلیٰ کیرکٹر اور وہ بلند کردار جو کسی اعلیٰ ترین قدر حیات کے ساتھ وابستہ ہونے سے ہی پیدا ہو سکتا ہے اس کی توقع ان سے کیونکر کی جا سکتی۔

اعلیٰ قدر حیات!

یہ وہی اعلیٰ قدر حیات ہے جس کے فقدان کو حکیم مشرق اقبال نے لادینی افکار کہا ہے ؎

مرگ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

اور یہی لادینی افکار ہے جس کے باعث عہد حاضر کا انسان اگرچہ سورج کی کرنوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن وہ خود اپنے من کی دنیا کو آباد نہیں کر سکا ہے ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

افکار میں وحدت [illegible] دین کا دوسرا نام خدا کو مرکز اطاعت ماننا ہے۔ اس کا لازمی اور نفسیاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ [illegible] عالی حوصلگی پیدا ہوتی ہے، [illegible] روشن اور دماغ منور ہوتا ہے۔ ظاہر و باطن یکساں ہو جاتے ہیں، قول اور عمل میں مطابقت ہوتی ہے، زندگی میں سوز و ساز اور [illegible] پیدا ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو اپنے ہر ارادہ و نیت اور ہر فعل و عمل کے لئے ایک ایسی ہستی کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے جو سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے [illegible] کائنات کا ذرہ ذرہ [illegible] پولیس [illegible] یا عدالت کا خوف نہیں ہوتا [illegible] کیا اس کا تصور بھی نہیں آتا [illegible] ایمان [illegible] اس لئے [illegible] اگر حرام [illegible] اطاعت [illegible] میں نہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ توازن [illegible] پیدا ہوتی ہے اور [illegible] میں قوت اور ارادہ میں مضبوطی۔

زندگی کی اس ساز کی طرح ہوتی ہے جس میں نغمہ [illegible] بے ہنگم بے رنگ و بو [illegible]

ایک شخص جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا [illegible] اخلاق حسنہ [illegible] صالح کا عامل ہو لیکن اس کے یہ [illegible] اور یہ اخلاق [illegible] اس کی ایک خاص طبیعت یا تربیت کا نتیجہ ہوں گے اور ان کی بنیاد جذبات پر قائم ہوگی۔ اس کے برخلاف جس شخص نے تمام جذبات و خواہشات کو خدا کا [illegible] عمل کا محرک بہ نسبت پہلے شخص کے زیادہ قوی [illegible] اس بنا پر پہلے سے بے اعتدالی ہو سکتی ہے لیکن دوسرے شخص سے یہ ممکن نہیں ہے۔

قاعدہ ہے کہ محرک [illegible] جس درجہ اور جس قوت کا ہو [illegible] بھی اسی درجہ اور اسی قوت کا ہوگا۔ تم ایک غریب آدمی کو مصیبت میں دیکھتے ہو، طبعی طور پر تمہارے دل میں اس کے ساتھ ہمدردی اور اس کی امداد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن جب اسی مصیبت میں اپنے کسی دوست [illegible] یا کسی محبوب ترین بیٹے یا بیٹی کو دیکھتے ہو تو [illegible] ہو جاتا ہے اور اس کی نسبت [illegible] بلکہ چند در چند ہو جاتی ہے [illegible] حرکت میں آگیا ہے اور [illegible] دولت اور [illegible] جگہ [illegible] کا [illegible] اور [illegible] اس کے ساتھ تعلق [illegible]

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

دوسری آخری قسط

اسلام میں اجتماعی کفالت

ہو تو اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنے کام کو مستعدی اور خوبی سے انجام دے۔ اس لئے کہ اس کے کام کا اثر پوری جماعت پر پڑے گا چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

ان اللہ یحب اذا عمل احدکم عملا ان یتقنہ

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ ہر آدمی اپنے کام کو بہتر طریقہ پر انجام دے۔

اسی طرح جماعت یا وہ ریاست جو جماعت کی قائم مقام ہو اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ہر فرد کے لئے روزگار فراہم کرے۔ اس طرح اسلام میں اجتماعی کفالت کا نظام حقیقت کے اعتبار سے صرف احسان و صدقہ کا نام نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اس اخلاقی تیاری اور ان کی پیداوار کا ایسا نظام بن جاتا ہے جس کے ذریعہ پیشے اور روپے پیسے انسان خود کفیل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

ایک بار ایک شخص آپ کے پاس کچھ مانگنے کے لئے آیا حالانکہ وہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی مال نہیں دیا بلکہ اس کے بجائے اس کے لئے ایک کلہاڑی فراہم کر دی اور فرمایا کہ جاؤ اور اس سے لکڑی کاٹ کر فروخت کرو اور اس کی آمدنی سے اپنی زندگی بسر کرو ساتھ ہی آپ نے اس کو واپس لوٹ کر آنے کی ہدایت بھی کی تاکہ آپ اس کی کارکردگی کو دیکھ سکیں اور اس کی حالت سے آگاہ ہو سکیں اس طرح آپ نے اس شخص کے لئے آلے کو فراہم کر کے اور مدد کی رہنمائی فرما کر گویا اس اصول کی بنیاد ڈال دی کہ جو کام کر سکتا ہے اسے کام ملنا چاہیئے اور یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لئے کام کر سکنے کے وسائل و ذرائع کی فراہمی کرے۔ تاکہ فرد اور جماعت کے درمیان اجتماعی کفالت کا عمل اپنی کامل ترین اور ہمہ گیر صورت میں کامیاب ہو سکے۔ اسلام نے اپنے اسی منصوبے کے تکملہ کے لئے سودی کاروبار کو بھی حرام قرار دے دیا ہے۔ سود کی حرمت اجتماعی کفالت کے نظام سے علیحدہ کوئی دوسری شئے نہیں ہے۔

اسلام اس مال کے تعلق سے جسے فرد نے جائز طریقے سے کمایا ہو انفرادی ملکیت کا اصول تسلیم کرتا ہے لیکن وہ انفرادی ملکیت کے ساتھ ساتھ ایک اور اصول کو لازم قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ

اور خرچ کرو اس مال کو جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ

اور دو ان کو اس مال میں سے جو اللہ نے تمہارے ہاتھ میں دیا ہے۔

ان ہی اصولوں کے تحت اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے اس لئے کہ سود ناجائز کمائی ہے مال کے اندر بجائے خود مال پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اصلاً وہ عمل یعنی کام ہوتا ہے اور اس کے مالک کی ذمہ داری صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے بار آور بنائے۔ اس لئے جب جماعت کا کوئی فرد اس مال کا حاجتمند ہو جسے وہ لوگ بار آور بنا رہے ہوں یا جس کے ذریعہ وہ اپنی ناگزیر ضرورتوں کو پورا کر رہے ہوں تو ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لئے غیر سودی قرضہ فراہم کریں تاکہ اجتماعی کفالت کا نظام بروئے کار آ سکے۔

اجتماعی کفالت کا نظام اس وقت تک صحیح طور پر برپا نہیں ہو سکتا جب تک کہ سودی نظام قائم ہے اور سرمایہ چند ایسے افراد کے ہاتھوں میں رکا پڑا ہے جو لوگوں کو کام کرنے اور انہیں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع اس وقت تک نہیں دیتے جب تک کہ وہ اس سودی منافع کو ادا نہ کر دیں جس کی عمارت عدل و انصاف پر نہیں اٹھائی گئی۔ اجتماعی کفالت کی بنیادوں پر بھی استوار نہیں ہوتی۔ یا الٰہی اور ادارہ کی گردش ہی وہ تنہا بنیاد ہے جسے اسلام اجتماعی کفالت کے نظام کو برپا کرنے کے لئے استوار کرتا ہے تاکہ اس میں ہر صاحب استطاعت کام کر سکے اور دوسرے تمام ہی افراد اپنے عمل کے ذریعہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

آخر میں ہم زکوٰۃ اور صدقہ کے متعلق گفتگو کریں۔ میں نے اسے سب سے آخر میں قصداً اس لئے بیان کیا ہے تاکہ یہ واضح کر سکوں کہ اسلام میں اجتماعی کفالت کا نظام جن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے یہ صرف ان کا ایک جزء ہے جب کہ بہت سے لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہی اس نظام کی واحد بنیاد ہے۔

اس بنیاد کی تعمیر کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے کہ عملی بنیادیں استوار ہو چکی ہوں اور ہر آدمی کو کام کرنے کی سہولت فراہم ہو چکی ہو، حاجت مندوں کو قرض مل جاتا ہو جو شخص روزگار کے لئے یا اپنے کھانے پینے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مال کا خواہش مند ہو اسے اس کی سہولت فراہم ہو جاتی ہو لیکن یہ واضح رہے کہ اسے جو چیز بھی دی جائے گی وہ سود سے پاک ہو خاندان کے افراد کے درمیان اجتماعی کفالت، مالی امور میں باہمی تعاون انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری اور معاشرے کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس نہ صرف مال کے تعلق سے بلکہ زندگی کے تمام ہی گوشوں میں اس کے بعد ہی ہو سکتا ہے جب کہ اجتماعی کفالت کا نظریہ فرد اور جماعت دونوں ہی کی تربیت میں پوری طرح پیوست ہو چکا ہو اور اجتماعی زندگی کی تنظیم ان مخصوص بنیادوں پر قائم ہو چکی ہو جن کی فرد اور جماعت دونوں ہی نگہداشت کر رہے ہوں اور یہ سب کے سب ان کو ان کا ہر طرح کی دست درازیوں سے بچا کر رہے ہوں خواہ ان کا صدور محکوم طبقے کے افراد سے ہو رہا ہو یا حکمراں گروہ کے فرزندوں سے۔

اب زکوٰۃ کی ادائیگی کا مرحلہ آتا ہے جو مال کے ایک حصہ کو دینے کا نام ہے جو بالکل معلوم اور متعین ہے ایسا نہیں ہو کہ اسے افراد کے وجدان اور ان کے اندازے پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ یہ ایک ایسا حق ہے جسے حکومت وقت وصول کرے گی۔ اور اگر اس کی ادائیگی میں ذرا بھی کوتاہی دکھائی گئی تو متعلقہ افراد سے جنگ کرنے کی بھی مجاز ہو گی۔ یہ کوئی انفرادی احسان کا معاملہ نہیں ہے جسے ایک شخص دوسرے شخص کو دیتا ہے اور وقت آنے پر اس پر احسان بھی جتا دیتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد زکوٰۃ کی وہ ناپسندیدہ اور دھندلی صورت خود بخود ماند پڑ جاتی ہے۔ جسے بعض لوگ اس طرح پیش کرتے ہیں گویا ایک شخص ہاتھ پھیلائے کھڑا مانگ رہا ہے اور دوسرا اسے کچھ عنایت کر کے اس پر احسان کا ایک بھاری بوجھ لاد رہا ہے۔ یہ فریضہ زکوٰۃ کی ایک جھوٹی اور من گھڑت تصویر ہے جو محض ان لوگوں کی کرشمہ سازی ہے جو اس نظام کی حقیقت سے یکسر ناواقف ہیں لیکن جان بوجھ کر ایک متعین مقصد کے تحت حقائق کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

صدقے کے سلسلے میں بھی عموماً یہ شبہ پایا جاتا ہے کہ وہ محض ایک شخص کا دوسرے شخص کے ساتھ احسان کرنے کا نام ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اس کی پوری طرح تردید کرتا ہو وہ ہم رجحان کیلئے یہ تصور دیتا ہے کہ وہ خدا کا قرض ہے جس پر اللہ تعالیٰ اسے اچھا بدلہ دے گا وہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ احسان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس عمل میں حقیقی فائدہ اس شخص کا ہوتا ہے جو خدا کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس لئے کہ وہ اس دنیا میں مال کو خرچ کر کے اپنے لئے آخرت فراہم کرتا ہے کسی کو اپنے فضل و احسان سے نہیں نوازتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وما تنفقوا من خیر فلانفسکم

اور تم جو کچھ مال خرچ کرو گے وہ تمہارے بھلے کے لئے ہے۔

وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ

اور تمہیں نہیں خرچ کرنا ہے مگر اللہ کی خوشنودی کے لئے

وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون۔

تم جو بھی مال خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا کمی کے بغیر۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ

وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں بہترین قرضہ دیں کہ اس کے نتیجہ میں اللہ اپنے مال کو بڑھائے اور ان کے لئے بہترین اجر ہو۔ اس طرح وہ شخص جو دوسرے کو دیتا ہے وہ اس محتاج پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا قرضہ پیش کرتا ہے اور اس لینے والے محتاج کی حیثیت اس دینے والے مالدار کے لئے محض واسطہ کی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا بدلہ وصول کرتا ہے۔

یہ ہے اسلام کی اجتماعی کفالت کے نظام کی صحیح تصویر جسے میں نے بہت اختصار سے پیش کیا ہے اسے دیکھ کر ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ فرد اور جماعت دونوں ہی کی تربیت کا ایک ایسا نظام ہے جو خاندان کے بچاؤ اور اس کے تحفظ کا بھی ضامن ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک ایسا نظام بھی ہے جو معاشرے کے تعلق سے افراد اور حکومت کے درمیان رابطے کا تعین بھی کرتا ہے اور سب سے آخر میں وہ ایک اقتصادی نظام بھی ہے جو مختلف میدانوں میں اقتصادی تعلقات کی حدیں بھی قائم کرتا ہے اور اس سلسلے میں کام اور پیداوار کے اس حصول کو اس کا سب سے پہلا وسیلہ قرار دیتا ہے یہی نہیں بلکہ اگر ہم روزگار اور سود کے موضوعات کی طرح بقیہ دوسرے موضوعات میں بھی اس کے بتائے ہوئے راستے کو جاننے کی کوشش کریں تو ہم پائیں گے کہ وہ ایک ایسا نظام ہے جو سارے اقتصادی تعلقات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ان توضیحات کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ اسلام میں اجتماعی کفالت کا نظام ایک ہمہ گیر نظام ہے وہ محض احسان و صدقہ اور نیکی کر دینے کا نام نہیں ہے جیسا کہ عموماً لوگ سمجھتے ہیں۔ تاریخ کے ایک زریں عہد میں اسلام نے اسی نظام کی بدولت ایک ایسے مثالی معاشرے کو جنم دیا جو اجتماعی کفالت کا ایک ایسا کامل نمونہ تھا جسے انسانی تاریخ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو بجا طور پر اس بات کا مستحق ہے کہ اس وقت تک اسے برپا کرنے کی جدوجہد کی جاتی رہے جب تک کہ وہ قائم نہ ہو جائے۔

بقیہ مسلمانوں کی پستی کا واحد علاج

خیر و برکت ہے اور اگر الفاظ بھی نہیں پڑھ سکتا تو تھوڑا وقت روزانہ قرآن مجید کی تعلیم میں صرف کرنا۔

(ب) اپنے بچوں اور اپنے محلہ اور گاؤں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی قرآن مجید اور مذہبی تعلیم کی فکر کرنا اور ہر کام پر اس کو مقدم سمجھنا۔

(۴) کچھ وقت یاد الٰہی اور ذکر و فکر میں گزارنا پڑھنے کے لئے کوئی چیز کسی شیخ طریقت متبع سنت سے دریافت کرے ورنہ کم سے کم سوم سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم اور درود و استغفار کی ایک تسبیح صبح اور ایک تسبیح شام معنی کا دھیان کرتے ہوئے بجی لگا کر اطمینان قلب کے ساتھ پڑھے۔ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

(۵) ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھنا اس کے ساتھ ہمدردی اور انکساری کا برتاؤ کرنا حسب استطاعت اس کی مدد کرنا آداب احترام کرنا۔ ایسی باتوں سے بچنا جو کسی مسلمان بھائی کی تکلیف و اذیت کا باعث ہوں۔

ان باتوں کا خود بھی پابند رہے اور کوشش کرے کہ ہر مسلمان اس کا پابند بن جائے جس کا طریقہ یہ ہے کہ خود بھی اپنا کچھ وقت دین کے لئے اور خدمت کے لئے فارغ کرے اور دوسروں کو بھی ترغیب دے کہ دین کی خدمت اور اشاعت اسلام کے لئے آمادہ کرے۔

جس دین کی اشاعت کے لئے انبیاء کرام نے مشقتیں برداشت کیں طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہوئے صحابہ کرام اور ہمارے اسلاف نے اپنی عمروں کو اس میں صرف کیا اور اس کی خاطر راہ خدا میں اپنی جانوں کو قربان کیا اس دین کی ترویج اور بقا کے لئے تھوڑا وقت نہ نکالنا بڑی بدنصیبی اور خسران ہے۔ اور یہی وہ اہم فریضہ ہے جس کو چھوڑ دینے کی وجہ سے آج ہم تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔

منی آرڈر کوپن پر
اپنا نام اور پتہ
خوش خط تحریر کریں

سول ایجنسیاں
اودھ جنرل اسٹور
امین آباد
لکھنؤ
ایس۔ ایم ظہیر اینڈ سنس
چمن گنج
کانپور

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

محمد ارشد اعظمی

(۱)

انسان کی تخلیق کا مقصد کائنات کی تکمیل اور اپنی عبادت و معرفت کرنے [illegible] اسی مقصد کے لئے ساری کائنات کو یہ فریضہ سپرد کیا گیا پھر اشرف المخلوقات انسان پر بھی یہ ذمہ داری اسی بنا پر عائد کیا گیا۔ اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی دنیا میں تشریف آوری سے مقصد اسی ذمہ داری کی یاد دہانی اور اس فریضہ کی ادائیگی ہوتا ہے۔ یہ حضرات اپنی اعلیٰ تعلیم سے اسباب غفلت کو ہٹا کر توجہ الی اللہ اور دین مبین کی اتباع و اطاعت کی روح پیدا فرماتے ہیں جس سے دنیا و آخرت کی زندگی سنورتی ہے اور دونوں جہاں کی عزت و فلاح نصیب ہوتی ہے۔

جب رحمت عالم حضرت آقائے مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گم گشتگان بادیہ ضلالت کو صراط مستقیم پر لگایا اور مقام انسانیت یاد دلایا شکوک و شبہات کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو چھانٹ کر علم و یقین کی روشنی دکھائی تو جماعت صحابہ میں سابقین اولین نے سبقت کی، گراں قدر سعادت حاصل کی۔ مردوں میں سیدنا ابو بکر صدیق اور عورتوں میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور نو عمر لوگوں میں حضرت شیر خدا علی ابن ابی طالب نے اور غلاموں میں حضرت زید ابن حارثہ نے سب پر سبقت اور فوقیت حاصل کی۔

عاشقان مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزم میں سے ہم جہاں نثار مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید ابن حارثہؓ کے حالات اور کردار و سیرت و شجاعت کے خدوخال نمایاں کرنا چاہتے ہیں جس میں آقائے مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و سیرت طیبہ اور عشق کا پیغام اور وہ عادات بلند حوصلگی کردار فراخدلی اور عالی ظرفی اور عشق و سوز کے جلوے نظر آئیں گے۔

نام و نسب ابتدائی حالات :-

زید اسم گرامی ہے ابو اسامہ کنیت، والد کا نام حارثہ اور والدہ کا نام سعدیٰ تھا۔ دور جاہلیت میں ایک بار حضرت زیدؓ کی والدہ آپ کو لے کر اپنے خاندان بنی معن سے ملنے گئیں اتفاق سے بنی قین بن جسر کے غارتگر سواروں نے رہزنی کی اور حضرت زید کو گرفتار کرکے بازار عکاظ میں لاکر فروخت کے لئے آواز لگائی۔

تو حکیم ابن حزام بن خویلد گزرے تو انھوں نے زیدؓ کو چار سو درہم میں اپنی پھوپھی حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے لئے خرید لیا۔ پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے حضرت زید کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ آقا و مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو آزاد فرما کر اپنا متبنیٰ بنا لیا اس وقت حضرت زید کی عمر شریف ۸ سال کی تھی۔[1]

ادھر حضرت زید کے والد حضرت زید کے فراق میں مضطرب اور بے قرار تھے اور حضرت زید کے فراق پر غمگین بھی چنانچہ اس اضطراب و بے قراری اور حزن و الم نے اشعار کا جامہ پہن لیا، ہم عربی اشعار کو چھوڑ کر اس کا اردو ترجمہ ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں تاکہ حقیقت عیاں ہو سکے۔

"میں نے زید پر گریہ و زاری کی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا ہو گئے آیا زندہ ہیں جس کی امید رکھی جائے یا ان کی وفات ہو گئی ہے۔ خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ اگرچہ پوچھتا بھی ہوں کہ کیا تم کو زمین نگل گئی ہے یا پہاڑ کھا گیا ہے؟ کاش میں جانتا کہ تمہارا واپس آنا بھی ممکن ہے؟ بس تیرا واپس آنا ہی میرے لئے دنیا میں کافی ہے۔ آفتاب اپنے طلوع ہونے کے وقت اس کو یاد دلاتا ہے اور جب غروب کا وقت آتا ہے تو اس کی یاد کو پھر تازہ کرتا ہے بادبہاری اس کی یاد کو برانگیختہ کر دیتی ہے آہ۔ مجھے اس پر کس قدر شدید رنج و الم ہے۔ عنقریب میں اونٹ کی طرح چکر لگا کر تمام دنیا چھان ماروں گا میں اس آوارہ گردی سے اپنی زندگی بھر نہیں تھکوں گا یہاں تک کہ اونٹ تھک جائے یا میری موت ہو جائے کہ ہر آدمی فانی ہے اگرچہ سراب امید اسے دھوکے میں ڈالے رہے میں قیس و عمرو دونوں کو اس کے جستجو کی وصیت کرتا ہوں اور یزید کو پھر ان کے بعد جبل کو وصیت کرتا ہوں" جبلؓ سے مراد جبلہ بن حارثہ ہیں جو حضرت زید کے بڑے بھائی تھے اور یزید ان کے اخیافی بھائی تھے۔ ایک سال بنی کلب کے چند آدمی حج کے خیال سے آئے تو انھوں نے اس یوسف گم گشتہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور یعقوب صفت باپ کو ماجرائے غم کہہ سنایا۔ حضرت زید نے کہا کہ یقیناً انہوں نے فرقت میں نوحہ خوانی کی ہوگی تم میری طرف سے میرے خاندان والوں کو یہ پیغام پہونچا دینا۔

"میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں گو ان سے دور ہوں میں خانہ کعبہ میں مشعر حرام کے قریب رہتا ہوں اس لئے اس غم سے باز آجاؤ جس نے تم کو پرالم بنا دیا ہو اور اونٹوں کی طرح چل کر دنیا کی خاک نہ چھانو الحمدللہ کہ میں بنی معد کے ایک معزز اور اچھے خاندان میں ہوں جو پشتہا پشت سے معزز ہے۔"

بنی کلب کے زائروں نے واپس جا کر ان کے والد کو اطلاع دی تو تعجب سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور خود یاس نے یک بیک یقین نہ ہونے دیا بولے "رب کعبہ کی قسم کیا میرا ہی نور تھا؟" ان لوگوں نے جب تفصیلی کے ساتھ حلیہ جائے قیام اور دیگر ہی کے حالات بیان کئے تو اسی وقت اپنے بھائی کعب بن شراحیل کو ساتھ لے کر مکہ کی طرف چل کھڑے ہوئے اور حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بصد منت و سماجت عرض کی۔

"آپ حرم اور اہل حرم کے مجاور ہیں مصیبت زدوں کی دستگیری فرماتے ہیں، قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں ہم آپ کے پاس اس غرض سے آئے ہیں کہ ہمارے لڑکے کو آزاد فرما کر ہم پر احسان فرمائیں ہم زرفدیہ دینے کو تیار ہیں۔ ارشاد ہوا وہ کون ہے؟ بولے

"زید"

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کا نام سنا تو ایک لمحہ تفکر کے بعد فرمایا بہتر! زید کو بلا کر اختیار دو کہ اگر وہ تمہیں پسند کرے تو تمہارا ہے اور اگر مجھے ترجیح دے تو خدا کی قسم میں ایسا نہیں ہوں جو اپنے ترجیح دینے والے پر کسی کو ترجیح دوں۔ حارثہ اور کعب نے اس شرط پر شکریہ کے ساتھ رضامندی ظاہر کی۔ حضرت زید بلائے گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تم ان دونوں کو پہچانتے ہو؟ عرض کی ہاں! یہ میرے باپ اور چچا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کے ہاتھ میں قرعہ انتخاب دیکر فرمایا۔ میں کون ہوں اس سے تم واقف ہی ہو! میری ہمنشینی کا حال بھی تم کو معلوم ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے چاہے مجھے پسند کرو یا ان دونوں کو" حضرت زیدؓ کو تاجدار دوعالم سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں جو لطف ملا تھا اس پر صد آزادیاں نثار تھیں۔ حضرت زید نے کہا میں ایسا نہیں ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو ترجیح دوں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی میرے ماں باپ ہیں" حضرت زید کی اس مخلصانہ وفا شعاری نے ان کے باپ اور چچا کو کو حیرت کر دیا تعجب سے بولے زید! افسوس تم آزادی، باپ اور چچا اور خاندان پر غلامی کو ترجیح دیتے ہو؟ فرمایا ہاں! مجھے اس ذات پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایسے ہی خاص نظر آئے ہیں کہ میں اس پر کسی کو بھی

ترجیح نہیں دے سکتا۔[1]

واقعی شاعر نے صحیح کہا ہے کہ

اسیرش نخواہد رہائی ز بند
شکارش نجوید خلاص از کمند

آپ کا اسیر آپ کی قید غلامی سے کبھی رہائی کا خواہشمند نہیں ہے اور آپ کے لطف و شفقت کا گرفتار آپ کے حلقہ سے خلاصی نہیں چاہتا۔

حضرت زیدؓ نے غیر متزلزل وفا شعاری سے آقائے شفیق کے دل میں محبت کی دبی ہوئی چنگاری کو مشتعل کر دیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں مقام حجر کے پاس لے جا کر اعلان فرمایا کہ۔

"زید آج سے میرا فرزند ہے میں اس کا وارث ہوں گا اور وہ میرا وارث ہوگا"

اس اعلان سے ان کے باپ اور چچا کے افسردہ دل گل شگفتہ کی طرح کھل گئے گو والد کو مفارقت گوارہ نہ تھی تاہم لخت جگر کو ایک شفیق و معزز باپ کی آغوش عاطفت میں دیکھ کر اطمینان ہو گیا اور اطمینان و مسرت کے ساتھ واپس گئے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی تعلق و محبت کی بنا پر تمام صحابہ میں حضرت زیدؓ ایک خاص امتیازی شان اور فضیلت کے مالک ہیں۔

(۲)

ضیاء اسلام :-

جب ضیاء اسلام فاران کی چوٹی سے نمودار ہو کر در و دیوار کعبہ پر پڑی تو غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زیدؓ نے نورانیت و اصلی کی اور دعوت حق پر لبیک کہنے میں فوقیت لے گئے۔

(۳)

شادی :-

حضرت ام ایمنؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ اور کنیز تھیں۔ حضرت زیدؓ کی شادی انھیں سے فرمادی۔ حضرت ام ایمنؓ ہی کے بطن مبارک سے حضرت اسامہؓ حضرت زیدؓ بن حارثہؓ کے صاحبزادے پیدا ہوئے۔[2]

(۴)

سفر طائف میں رفاقت :-

رحمت عالم حضرت آقا و مولا جناب حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت حق، تبلیغ اسلام رشد و ہدایت کا کار عظیم انجام دینا شروع کیا تو ضیاء اسلام سے کفر و شرک و جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھٹ رہی تھی اور دین حق اپنی ضیا بیز کرنیں بکھیر رہا تھا لیکن کفار رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی تکالیف اور اذیتیں پہونچا رہے تھے اور مخالفت حق کے منصوبے بنا رہے تھے اور اشاعت حق میں روڑے اٹکا رہے تھے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رشد و ہدایت دعوت و تبلیغ کے لئے طائف کا سفر فرمایا اس مبارک سفر میں حضرت زید بن حارثہ کو رفاقت اور معیت نصیب ہوئی تھی۔ سفر طائف کا دردانگیز نقشہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے الفاظ میں سنئے۔ تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ بھی کھاتا کہ انہیں سنتے، شاید دوسرے سنیں، یہاں جی نہیں لگتا شاید وہاں دعیٰ طائف میں، لگے یہی سوچ کر زیادہ دور نہیں بلکہ امراء مکہ کے گرمائی اسٹیشن طائف کا خیال آیا۔ زید بن حارثہ، وہ آزاد غلام کے ساتھ کوئی نہ تھا"[3]

پھر طائف میں کیا برتاؤ کیا گیا اور وہاں کے لینے والوں نے کیا سلوک کیا اور رفیق سفر حضرت زید اس دردانگیز حالت کو دیکھ کر اس قدر بے قرار ہوئے اسے بھی موصوف نامی کی اثر انگیز تحریر میں ملاحظہ فرمائیے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ اداریہ

کا ہے جو فقہ اسلام میں گہری بصیرت رکھتے ہوں اور جن کو شریعت اسلامیہ میں تبحر اور پختگی حاصل ہو اور وہ اجتہاد کے مواقع اور اس کی ضرورت سے اچھی طرح واقف ہوں۔

رہے وہ احکام و مسائل جو براہ راست کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور جن کے بارے میں نص وارد ہے وہ کسی حال میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اور نہ کسی بڑے سے بڑے صاحب علم و بصیرت کو ان کی طرف نظر اجتہاد اٹھانے کا حق ہی ہے، قرآن کریم نے صاف صاف اعلان کر دیا ہو کہ "ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب"

مسلم پرسنل لا کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش پیدا کرنا کسی بشر کا کام نہیں ہے اور نہ کسی کو اس بارے میں کوئی اختیار ہی حاصل ہے یہ آواز اور جو بہت سے مسلم ممالک میں اٹھ رہی ہے کہ اسلامی قانون نظر ثانی کا محتاج ہے اور بہت سے مسائل میں تبدیلی کی ضرورت ہے، بعض مسلم ممالک نے اس طرح کے اقدام کرنے کی جرأت بھی کی ہے۔ مگر کسی جرأت یا مطالبہ سے متاثر ہو کر اہل علم شریعت الٰہی میں تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہیں، وہ ایک ایسی امانت کے امین ہیں جس میں خیانت کرنا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کرنے کے مرادف ہے۔

ہمیں اس طرح کے مطالبات کی روح کو سمجھنا چاہئے اور یہ محسوس کرنا چاہئے کہ یہ اور اس طرح کی کوششیں دراصل اسلامی نظام کو پامال کرنے اور شریعت اسلامی کی عظمت کو دلوں سے نکالنے اور اسلام کو خود مسلمانوں کے ممالک میں بے یار و مددگار بنا کر چھوڑنے کی وہ ناپاک سازش ہے جو مسلمان عوام و خواص ہر ایک کے لئے ایک عظیم چیلنج ہے۔ لیکن اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے کیا تیاری کی ہے؟

بقیہ قرآن کا پیام

بھی ہوں ان کا مجموعی حصہ ترکہ کا ۱/۶ ہی رہے گا۔ باقی ۵/۶ میں اور اعزا وخاص شریک ہوں گے تفصیل فرائض کی کتابوں میں ملے گی۔

(کل ترکہ)

اور بقیہ نصف حصہ میں دوسرے مستحقین اور وہ شریک ہوں گے لیکن اگر وہ موجود نہ ہوں تو پھر وہ نصف بھی اسی لڑکی کی طرف عود کر آئے گا۔

اور بقیہ ۵/۶ اولاد اور دوسرے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور خواہ تعداد میں ایک ہو یا زائد۔

(اور بقیہ دو تہائی باپ کا)

و ورثہ ابواہ۔ یعنی علاوہ اولاد کے بھائی بہن نہ ہوں صرف ماں باپ ہی وارث ہوں

(اور بقیہ ۵/۶ حصہ باپ کا)

باپ کے باعث بھائی بہنوں کو حصہ نہ ملے گا۔

فان کان لہ اخوۃ یہ بھائی بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یہ وہ صورت ہے کہ میت کے اولاد کوئی نہیں لیکن ماں باپ بھی ہیں اور بھائی بہن بھی۔

اخوۃ کا لفظ یہاں بھائی بہن دونوں کے لئے صیغہ مذکر قاعدہ زبان کے مطابق محض تغلیباً لایا گیا ہے۔

(اگر کچھ ہو)

وارثوں کو حصہ اس وقت ملے گا جب پہلے مورث کا قرض ادا ہو لے اور اگر وہ ایک تہائی جائداد سے متعلق کچھ وصیت کر گیا ہے تو اس وصیت کا اجرا ہو لے فقہائے بیان در قاعدے اور بیان کئے ہیں ایک یہ کہ قرضہ اور وصیت میں ادائے قرض مقدم ہے گو قرآن مجید میں لفظ وصیت پہلے لایا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ ادائے قرض اور اجرائے وصیت ان سب سے پہلے مورث کی تجہیز و تکفین کے خرچ کا انصرام ہو لینا ہے۔ اور لفظ اولاد سے اشارہ ادھر کو رہا ہے کہ درجہ کے لحاظ سے اجرائے وصیت اور ادائے دین برابر نہیں ہیں۔ اور ادائے دین کا تقدم حکم شرعی کی بنا پر ہے۔

اقبال اور ان کا فلسفۂ خودی

محمد حسن بہاری، متعلم درجہ ششم عربی

شاعر مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے، بوقت وفات آپ کی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی۔ وفات سے دو دن قبل آپ کی بے تابی اور حسرت و شوق آپ کی … نے ان منظوم الفاظ میں ظاہر کی جس کی خلش آج بھی دلوں کو بے قرار و بے تاب رکھتی ہے۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیم از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

آپ کے جد اعلیٰ گو برہمن تھے لیکن مزاج میں حق پسندی تھی چنانچہ جب اسلامی حقانیت کا سامنا ہوا تو حقیقت بیں نگاہ نے آئینۂ حقیقت میں معبود حقیقی کو فوراً پہچان لیا اور تمام دیوی دیوتاؤں کو جن کے سامنے ہمیشہ سے سر جھکا آیا تھا … ٹھکرا دیا، اور خالق حقیقی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور سربسجود ہو گئے۔ اسی وقت سے صلاح و تقویٰ ان کی رگ رگ میں رچ گیا اور خود اقبال کے والد محترم بڑے ہی متقی اور پرہیزگار اور دیندار شخص تھے۔

اقبال نے انگریزی تعلیم اپنے وطن سیالکوٹ کے اسکول میں حاصل کی۔ اسکول میں پانچویں جماعت کا امتحان وظیفہ لیکر پاس کیا پھر اسی طرح مڈل میں بھی نہایت کامیابی کے ساتھ وظیفہ حاصل کیا پھر انٹرنس کے امتحان میں بھی پرائمری اور مڈل اسکول کی طرح کامیاب ہوئے پھر اس کے بعد اسکاچ مشن کالج میں داخل ہوئے جہاں سید میر حسن جیسے قابل شفیق اور تجربہ کار و شفیق استاد کے ساتھ … سید میر حسن نے اقبال کو اپنے رنگ میں رنگ دیا جو ظاہر … علوم کا بہت ہی … ثابت ہوا۔ اقبال ساری عمر اس بار احسان تلے جھکے رہے اور سید میر حسن کو کبھی فراموش نہ کر سکے لیکن اب دنیا اقبال کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

شیکسپیئر … پر بجا طور پر ناز کرتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ یہ بھلائے نہیں جا سکتے لیکن جب ہم ان کے مقابلے میں اقبال کو لاتے ہیں تو یہ اس میدان میں ان کے شکسپیئر اور گوئٹے … آتے ہیں یعنی گوئٹے، شکسپیئر اور نطشے اس خون جگر سے محروم ہیں جسے اقبال کی تپش پیش کرتی ہے اس لئے دنیا اقبال کو کیسے فراموش کر سکتی ہے۔

اقبال دور حاضر کے وہ باکمال شاعر ہیں جن کی شاعری محض شاعری ہی نہیں بلکہ ایک مقصد عظیم ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جن کے حرف حرف میں رنگینیاں مسکراتی ہیں اور لفظ لفظ میں رعنائیاں جھلکتی ہیں۔ وہ فلسفی ہیں جو راز نہاں ہستی کی جھلک دکھا کر تجلی حق سے دل کو منور کرتے ہیں اور تخیلات کی لامحدود جولانیوں سے عالم بالا کی طرف پرواز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایسے انقلابی شاعر ہیں جو الفاظ کی دلنشینی اور معنی کی جگر تابی سے گولہ بارود کا کام لیکر طبائع میں ایک ایسا ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں جو غلاموں کو آزاد اور ناکاروں کو تاجور بنا دے اور قرون اولیٰ کی سادگی اور صدق و خلوص کے ترجمان ہیں۔ بقول مولانا ابو الاعلیٰ مودودی "جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہکنے لگتے ہیں یہ مرحوم اس سمندر میں پیٹھا تھا۔ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا اس منجدھار میں پہنچ کر اور اس سے زیادہ مسلمان ہو گیا۔ بلاشبہ یہ اس فلسفی P.H.D کا وہ نتیجہ فکر ہے جو اسلامی رنگ میں ڈوبا ہوا فلسفہ حقیقت کی ترجمانی کا حامل ہے۔"

وہ نوجوانوں کو فریب مغرب کی تباہ کاریوں سے بچا کر اور تصنع سے پاک دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ شاعر ان ایسے فرد ہیں جو خود بیدار ہیں اور دوسروں کو بھی بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ عالم عمل میں مردانہ وار گامزن ہیں اور دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلانا چاہتے ہیں انہوں نے عشق اور عشق کے ساتھ زندگی کے صحیح احساس کو پا لیا اور چاہتے ہیں کہ ان کی قوم بھی اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہو۔

وہ اسلاف کی عظمت کو بار بار اس لئے یاد دلاتے ہیں کہ مسلمان پھر سے ان کی پیروی کر کے غلامی کی ذلت سے نجات حاصل کر سکیں اور اپنے بھٹکے ہوئے قافلہ کو ایک دفعہ پھر حجاز کا راستہ دکھانے کی کوشش میں ہیں ان کا دل مسلمانوں کی موجودہ بے حسی اور جمود کو دیکھ کر کڑھتا ہے اس لئے وہ احساس خودی، خلوص کے پاکیزہ جذبات کو ایک دفعہ پھر ان کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حقیقت نما سرزمین ہسپانیہ کی سیر کرتے ہیں عظمت اسلام کی زندہ مثال مسجد قرطبہ دیکھ کر ان کا دل مومن بے قابو ہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو۔ مسجد قرطبہ ایک جلیل القدر قوم کی جفاکشی، جانبازی، فہم جوئی اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے۔ سنگ و خشت کے ذریعہ کسی نے اپنے سوز دل کو ظاہر کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں زمانہ کی چیرہ دستیوں کے ہاتھوں کائنات کی کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی نہ سلطنت نہ ہنر اور نہ شخصیت دنیا کی ہر چیز بے ثبات اور ناپائیدار ہے … سال قبل اندلس کی حالت کچھ اور تھی اور اب کچھ اور ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

لیکن اقبال اپنے نغمے کو اس مایوسی کی لے پر ختم نہیں کرتے بلکہ کائنات کی ناپائیداری میں ایک عنصر ایسا ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا وہ عنصر عشق ہے اس کے مظاہر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ہسپانیہ میں آج مسلمان نہیں ہیں لیکن ان کی تہذیب کی روح مسجد قرطبہ کی شکل میں موجود ہے ممکن ہے آگے چل کر مسجد قرطبہ بھی نہ رہے لیکن اسلامی روح زندہ رہے گی اس لئے کہ اس کی ساخت عشق سے تعمیر ہوئی ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

یہ ہے اقبال کی فکر و جاہت اور ان کا قومی درد۔ قدرت اقبال جیسی برگزیدہ خصوصیات کو بار بار منصۂ شہود پر نہیں لایا کرتی ہے بلکہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

معزز قارئین! ایسے شاعر باکمال کو محض سمجھنا اور اس کی … یا اس کے پیغام کی ترجمانی کرنا ہم جیسے تنگ نظر کا کام نہیں جیسا کہ پیام اقبال میں عبدالرحمن ابن طارق رقمطراز ہیں

"چاند کا عکس سمندر میں دریا میں ندی میں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے تالابوں میں بھی نظر آتا ہے مگر ان میں سے ہر ایک کا انعکاس نور اس کے اپنے ظرف اور صفائے باطن پر موقوف ہو۔ بالکل یہی حال انسانوں کے مختلف طبائع کا ہے۔"

آئیے اب ہم فلسفۂ خودی پر غور کریں کیا ہے خودی اور کیا ہے اس کا فلسفہ۔

عبدالرحمن ابن طارق خودی کی تعریف پیام اقبال میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔

"خودی انسان کا ذاتی کمالات اور فطری تاثرات سے باخبر ہو کر عملی طور پر ان کی حفاظت کرنے کا نام ہے۔"

شاعر باکمال کے نزدیک یہی وہ معیار ہے جس کے اندر سر خود پنہاں ہے وہ کہتا ہے جس کیفیت میں کامیابیوں کا راز اور فلاح زندگی مبہم و مضمر ہے وہ خودی اور اس کا لازمہ سوز و ساز ہو یہی وہ مقصد رفیع ہے جہاں سے فلاح و فوز کے سوتے پھوٹتے ہیں اگر یہ چشمۂ حقیقت واقعی تمہارے اندر مثل سوتہ زن چشمہ رہا تو تیری شاہی ہے ورنہ رسوائی۔ چنانچہ یوں آواز دیتے ہیں۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

انسان کی زندگی کی شاہراہ میں جوں جوں قدم آگے بڑھتا ہے توں توں وہ اپنی باطنی قوتوں سے بے خبر ہوتا چلا جاتا ہے شکوک اور شہادت کی تاریکیاں اسے گھیر لیتی ہیں۔ وہ دوسروں کی طرف دیکھتا ہے لیکن خود کو فراموش کر دیتا ہے۔ اسے یہ سرمدی پیغام یاد نہیں رہتا۔

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

اور یہ تمام باتیں محض اپنے اعتقادی کمزوریوں کی وجہ سے ظہور میں آتی ہیں ورنہ اگر انسان اپنی ذاتی کمالات کی طرف نظر کرے اور اپنی قدر آپ کرنے لگے تو پھر دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو وہ مسخر نہیں کر سکتا۔ خدا نے تو ازل ہی سے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت سراپا خیر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری اخلاقیات کا اہم لباب اور کامیابی کا صحیح راستہ ہمارے جذبات کا صحیح تنظیم اور اپنے اندرونی خودی کو باقی رکھنا ہو جیسا کہ شاعر کی صدا ہے۔ چہ

جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

اگر ہمارے جذبات کی صحیح تنظیم ہو جائے تو پھر ہم نہ صرف دنیا کی حسین چیزوں سے زندگی کے اچھے اچھے سبق حاصل کر سکتے ہیں بلکہ اس طور پر بیان کی قبیح اور ناخوشگوار اشیاء بھی ہمارے لئے خضر راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

جیسا کہ فطرت و خودی کے متعلق رچرڈ لولیس کا مقولہ ہے:-

Mind is its own place and in It self can Make a Heaven of hll and a Hell of Heaven.

یعنی دل میں فی الحقیقت ایک مستقل دنیا ہے جو اگر چاہے تو دوزخ سے بہشت بنا سکتا ہے اور بہشت سے دوزخ۔

اقبال کو عارف خودی کہا جاتا ہے لیکن خودی انھیں کی نگاہ میں نہیں بلکہ یہ موضوع بہت پرانا ہے ہر دور میں اس پر غور کیا جاتا رہا ہے اور اس کے متعلق مختلف نظریات قائم ہوتی رہی ہیں البتہ اقبال تمام مفکرین خودی میں ممتاز و کامیاب ثابت ہوئے باوجود اس کے کہ خودی مختلف فیہ اور ایک غیر معین مسئلہ ہے مختصراً تحریر کرتا ہوں۔

علامہ سید سلیمان ندوی جوہر اقبال کے اندر رقمطراز ہیں:-

"جس قدر خودی کو تکوین و تعمیر اور خودی کو محسوس اور موجود شکلوں کے اقرار و انکار میں اختلاف ہے اتنا شاید انسان کے کسی دوسرے حس کے متعلق نہیں پایا جاتا جتنے منہ اتنی ہی باتیں اور جتنے خیال اتنی رائیں ہر ایک اپنی دلیل میں مضبوط اور اپنے خیال میں ٹھیک معلوم ہوتا ہے ایسی الجھی ہوئی بحث اور ایسے نازک مسئلے پر کچھ کہنا اور کسی گروہ کی تائید اور کسی کی تردید کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ کیونکہ انسانی طبیعت کی ان سیمابی کیفیتوں کو جو مضطرب بھی ہیں اور منتشر بھی کسی ایک نقطے پر نہیں لایا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ خاموش رہنا بھی ممکن نہیں۔ روح کی اسی داخلی زندگی کو سمجھنا اور سمجھانا انسانیت کے عروج و زوال کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔

اگر اقبال ایسے اہم ضروری مسئلے کو محض وقتی الجھاؤ اور اس کے ساتھ بات کی پیچیدگیوں سے ڈر کر نظر انداز کر جاتے تو پھر یہی نا انصافی ہی نہیں ہوتی بلکہ اقبال کو اقبال بننا بھی نصیب نہ ہوتا۔"

جو لوگ خودی کے منکر ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ

"خودی نام ہے انسانی طبیعت کی سرکش قوتوں کا۔"

دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ زندگی کی یہ کشاکش جس میں دغا، فریب، ظلم اور ناانصافی کا ہاتھ زیادہ تیزی اور زیادہ قوت کے ساتھ کام کرتا ہے انسان کے اسی سرکش طبیعت کا نتیجہ ہے" غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے جہاں تک دلیل کا تعلق ہے بات معقول ہے اور سمجھ میں آتی ہے۔ واقعی اگر دنیا کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا جائے تو چیرہ دستیوں اور خون آشامیوں، خودغرضیوں اور خودپرستیوں کے سوا باقی تمام اجزاء کا پتہ بھی نہیں چلے گا اور اگر ہوں گے بھی تو ایسے ہیں جیسے … غالباً یہی وجہ ہے کہ فلسفیوں کا ایک گروہ مفقود … یہ دنیا کو پاپیوں اور جنگلوں … گنہگاروں کا مسکن قرار دیتا ہے اور اسی سے … کوئی … رہبانیت کی راہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ لیکن شاعر مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اسلام کے نزدیک خودی انسانیت کی بقا اور ترقی کے لئے حد درجہ مفید اور ضروری ہے کیونکہ وہ ایسا نظام زندگی ہے جو آدمی کو نہ صرف فرشتہ خصلت بنانا چاہتا ہے اور نہ حیوان وہ صرف ایسا انسان بنانا چاہتا ہے جو اپنی ملکوتی اور حیوانی امیجز کو اعتدال سے استعمال کرتا ہو اور اس میں وہ جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے وہ ہستی پر ناز کر سکے اسی لئے اسلام خودی کو انسانی احساسات میں سب سے اعلیٰ جوہر قرار دیتا ہے طبیعت کی یہی سرکش قوتیں ہیں جن کے بوجھ سے گھبرا کر ہندو فلسفی رہبانیت اور خلوت گزینی اختیار کر کے خودکشی پر مجبور ہو گئے۔ … دراصل خودی ہی شاعر اعظم کا عنوان شاعری ہے کیونکہ جب بھی کوئی بحر اقبال میں غوطہ زن ہوا ہر طرف سے صدائے خودی پائی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

بقیہ دین کی تعریف اور ضرورت

کی نوعیت و مقدار متعین کرتی ہیں۔

غرض جو بھی چیز ہمارے اعمال یا فکر و عقیدہ کی محرک ہوگی خواہ وہ ملک و قوم ہو یا حکومت و سلطنت چونکہ ہمارا اس کے ساتھ ایک گونہ تعلق ہے یعنی ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ چیز ہماری ہے اس بنا پر اس تعلق سے جب ہمارا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور قوت عمل میں تحریک ہوتی ہے تو وہ بالکل بے لوث نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک گونہ شائبہ خود غرضی ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک سپاہی جو میدان جنگ میں صرف اپنے ملک کے لئے لڑ رہا ہے ممکن ہے کہ اپنے آپ کو خطرات میں محصور دیکھ کر غداری کر بیٹھے اور میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جائے کیونکہ ملک کے لئے لڑنا … کوئی … اس کے ذہن و دماغ پر مستولی نہ ہو ایک طرح کی خود غرضی ہے اور خود غرضی کا ہمیشہ کا قاعدہ ہے کہ جب ایک چھوٹی غرض کا بڑی غرض سے مقابلہ ہوتا ہے تو انسان فطرتاً بڑی غرض کی خاطر چھوٹی غرض کو ترک کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک دیندار سپاہی ہے جو ملک کی حفاظت اور قوم کی … کو خدا کی اطاعت … ایک فرض سمجھتا ہے وہ لاکھ خطرات میں گھر کر بھی غداری نہیں کرے گا۔

(باقی آئندہ)